احمد جاوید صاحب

www.bookmaza.com

تزکیہ نفس

جناب احمد جاوید

گزشتہ دنوں علامہ احمد جاوید صاحب کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت موصوف کو قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کراچی کے مرکز تعلم وتحقیق میں ''تزکیہ نفس'' کے عنوان پر خطاب کی دعوت دی گئی جو آں جناب نے انتہائی شفقت کے ساتھ قبول فرمائی۔اکیڈمی میں کیے گئے اس پُر اثر و پُر مغز خطاب اور سوال وجواب کو قرآن فہمی کورس سال دوم کے طالب علم جناب عبدالرحمٰن صالح نے مضمون کی صورت میں مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی۔افادۂ عام کے لیے اس اہم موضوع پر محترم احمد جاوید صاحب کی گفتگو ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے۔(ادارہ)

ارسال کردہ: مرکز تعلم وتحقیق' قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کراچی

احمده واصلی علی رسوله الکریم...... اما بعد:

آج جس موضوع پر مجھے کچھ معروضات پیش کرنی ہیں اس کی دینی ضرورت اور اس کی دینی اسناد تو بہت معروف شکل میں واضح ہیں۔ میں کوشش کروں گا اس بات کو واضح کروں کہ تزکیہ نفس' انسانی شخصیت کی مقصدی تشکیل اور تکمیل میں بنیادی اہمیت کیسے رکھتا ہے؟ مجھے امید ہے اس کے نتیجے میں ہم اس ضرورت کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے ایک فطری آمادگی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ جو بہت بڑی اور بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں اور جن کی تکمیل پر گویا ہمارے ''ہونے' نہ ہونے'' کا دارومدار ہوتا ہے' ان کا شعور رکھنے اور ان کو اہمیت دینے کے معاملے میں ان پر ذہن کا بہترین استعداد کے ساتھ قائل ہونا اور ان کی طرف طبیعت کا اپنی بنیادی قوت کے ساتھ راغب ہونا نہایت مفید اور بہت ضروری ہوتا ہے۔

موضوع کی اہمیت

دینی فکر کی بعض جدید روایتوں میں ایک چلن پیدا ہوا کہ تزکیۂ نفس کو اسلام کا ''مقصودِ اعظم'' قرار دیا جائے' لیکن اس حد تک بڑھنا شاید مناسب نہ ہو' یعنی یہ کہنا کہ تزکیۂ نفس ہمارے دین کا ''مقصودِ اعظم'' ہے' اس کو ذرا mild کر کے اور نسبتاً قابلِ قبول بنا کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا دین ہمارے سامنے جو مقاصد مستقل انداز سے متعین کر کے رکھتا ہے' ان کی طرف ذہناً اور طبعاً یکسو ہوئے بغیر دین کے ساتھ تعلق کی کسی زیادہ قابلِ اعتماد بنیاد پر نہیں رہا جا سکتا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو چیز واحد ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے ''تزکیۂ نفس''۔ نفس کا تزکیہ کیے بغیر اور تزکیے کے عمل کو آخری سانس تک نبھائے بغیر دین کے نظامِ مقاصد سے ہم آہنگ نہیں رہا جا سکتا' یعنی ہم اپنے دین کے ساتھ اس کی مطلوبہ وابستگی کو پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

نفس

ہمیں پہلے قدم پر یہ سمجھنا ہے کہ ''نفس'' کیا ہے۔ یعنی جس نفس کا تزکیہ ہم اپنا مطلوب و مقصود سمجھتے ہیں' وہ ''نفس'' کیا ہے؟...... اور میرے خیال میں یہ بات یاد رکھنے' اور ہمیشہ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ نفس کی گہری معرفت کے بغیر تزکیہ کا عمل ناقص رہتا ہے۔

''تزکیہ'' کے لیے نفس کی گہری پہچان میسر ہونا ضروری ہے۔ اگر نفس کی پہچان میں کوئی سطحیت ہوئی تو تزکیہ کے عمل میں بھی وہی سطحی پن پیدا ہو جائے گا اور تزکیہ زیادہ گہرائی تک مؤثر نہیں رہے گا۔ نفس کو سمجھنے کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''نفس گویا کل وجودِ انسانی ہے'' اور اس کے تین بنیادی اجزاء ہیں۔ یعنی نفس تین دائروں سے بننے والی ''اقلیم'' کا نام ہے۔ اس کا پہلا دائرہ یا مرحلہ ''طبیعت'' ہے۔ دوسرا دائرہ ''ارادہ'' ہے۔ تیسرا دائرہ ''ذہن'' ہے۔ طبیعت' ارادے اور ذہن کے مجموعے کو ''نفس'' کہتے ہیں۔ یعنی نفس کی ترکیب میں طبیعت' ارادہ اور ذہن شامل ہیں اور تزکیہ ان تینوں درجات میں مطلوب ہے۔ نفس کی یہ تعریف ہمارے ذہنوں میں رچنی چاہیے' تاکہ ہم نفس میں سدھار کا کوئی کلی' مجموعی اور زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کر سکیں۔

اب ہم نفس کے اجزاء کی طرف آتے ہیں جو علی الترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ''طبیعت'' رغبت و بے رغبتی کا ماخذ ہے۔

(۲) ''ارادہ'' صحیح اور غلط کی طرف پیش قدمی کرنے کی قوت ہے۔

(۳) ''ذہن'' حق اور باطل میں تمیز کرنے کا آلہ ہے۔

اس بات کو اگر زیادہ اصولی انداز سے کہا جائے تو یوں ہوگی: چاہے دین ہو یا دنیا' اصل میں ہمارے چار ہی معیار ہیں۔ ہمارے شعور اور ہماری زندگی کے لیے چار ہی راستے ہیں جن پر ہم چلتے رہتے ہیں۔ یعنی ہم ہر چیز کو چار کھڑکیوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

پہلا تناظر: یہ چیز حق ہے یا باطل ہے۔ دوسرا تناظر: یہ چیز صحیح ہے یا غلط ہے۔ تیسرا تناظر: یہ چیز مفید ہے یا مضر ہے۔ چوتھا تناظر: یہ چیز مرغوب ہے یا مکروہ ہے' یعنی چیز رغبت کا موضوع ہے یا کراہت کی پیدائش کا سبب ہے۔ یہ چار تناظر (perspectives) ہر انسان میں خلقتاً رکھے گئے ہیں' اور ہمارا دین ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان چاروں perspectives کو ان کی اصولی ترتیب اور ترجیح کے ساتھ عمل میں رکھیں۔ یعنی اب دینی نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس یہ ہوا کہ ہم ہر چیز پر پہلا perspective اور پہلا معیار جو apply کریں وہ یہ ہونا چاہیے کہ ''یہ چیز حق ہے یا باطل؟'' اگر وہ حق ہونا qualify کر لیتی ہے تو اب ہمیں دوسرے perspective کی رو سے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس حق کی جو تعبیر ہم قبول کر رہے ہیں وہ ''صحیح ہے یا غلط؟'' تو حق قبول کر کے اس کی صحت محفوظ کرنا اور اس کی تعبیری صحت دریافت کر کے محفوظ کرنا' یعنی حق کی صحیح پہچان اور اس کی صحیح تر تعبیر' یہ گویا پہلے دو معیار ہیں۔

اسی طرح تیسرا perspective یہ ہونا چاہیے کہ جب حق کی قبولیت' معیارِ صحت کو qualify کر جائے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا ہم اس چیز کی افادیت کو کیسے generate کر سکتے ہیں؟ ہم حق کو اس کی صحت کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید کیسے بنا سکتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں ہم حق کو اصلِ افادیت کیسے بنا سکتے ہیں۔ چوتھا perspective یہ ہونا چاہیے کہ ہم حق کی طرف اپنی طبیعت کو اس کی پوری استعدادی رغبت کے ساتھ یکسو کیسے رکھ سکتے ہیں؟ مختصر یہ کہ ''نفسِ مزکیٰ'' اس شخصیت کا نام ہے جس کا مدار و محور' جس کا مطلوب و مقصود حق ہو اور حق ہی اس کے لیے مادۂ صحت ہو' حق ہی اس کے لیے اصلِ افادیت ہو اور حق ہی اس کو مرغوب و محبوب ہو۔ نفس جب ان چار مراحل کو ان کی شرائط کے ساتھ پورا کر لے تو وہ نفس ''نفسِ مزکیٰ'' کا مصداق ہے۔

موجودہ دین داری اور سلف کی دین داری کا موازنہ

ہمارے موجودہ اسلوبِ دین داری کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں دین ان چاروں

معیارات سے چھن کر ہماری متاعِ عزیز نہیں بنا' یعنی دین کی حقانیت ذہن کی بہترین قوت کے ساتھ ثابت ہونی چاہیے۔ دین کی صحت' استدلال کے بہترین مادے کا نتیجہ ہونی چاہیے اور دین کی افادیت' ارادے کے productive ہونے سے ثابت ہوتی رہنی چاہیے اور دین کی محبوبیت طبیعت کے مسلسل اور مستقل میلان سے چھلکنی چاہیے۔

ہم نے اپنے دین کو اپنی شخصیت کے بعض اجزاء سے متعلق کر رکھا ہے اور اپنی شخصیت کے کچھ ضروری حصوں کو اپنے دین سے لاتعلق کیا ہوا ہے' اور خود کو مجموعی طور پر دین کی تحویل میں نہ دے سکنا' یہ ہمارا اجتماعی نقص ہے' جب کہ ہمارے اسلاف کے لیے کوئی بھی علم' کوئی بھی عمل' کوئی بھی رغبت و کراہت' کوئی بھی منفعت و معضرت' یہ ساری کی ساری ایک دینی رنگ میں تھیں۔ وہ چیزوں کے ساتھ تعلق کا کوئی ایسا زاویہ اختیار نہ کرتے تھے جو زاویہ ان کو دین سے فراہم نہ ہوا ہو۔ ان کے نظامِ تعلق کی ساری بنیاد ''تعلق مع الحق'' پر استوار تھی۔ ان کے ظلم عداوت کا سارا مادّہ ''البغض فی اللہ'' کے مادّے سے پھوٹتا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنے نفس کو اپنی تمام تر جامعیت اور کلیت کے ساتھ اپنے دین کی تحویل میں دے رکھا تھا۔

تزکیہ کسے کہتے ہیں؟

تزکیہ کہتے ہیں کسی چیز کو حالت خیر پر محفوظ رکھنے اور اس کی نشوونما کا سامان کرنے کو۔ کوئی ایسی چیز جو خیر اور شر دونوں کا مجموعہ ہو' اس چیز میں سے شر کے ازالے کا سامان کرنا اور خیر کو نشوونما دینے کی صورت نکالنے کے عمل کو تزکیہ کہتے ہیں۔ خیر اور شر دونوں محض اخلاقی نہیں ہیں۔ دورِ جدید کی ایک بہت بڑی شیطنت یہ ہے کہ اس نے دینی مقاصد کو عام اخلاقی مقاصد اور داعیات سے بدل دیا ہے۔ یعنی دورِ جدید کا فلسفۂ اخلاق دین پر ایک بہت بڑی ضرب ہے۔ ہمارا تصورِ نفس اور ہمارا تصورِ تزکیہ یہ ہے کہ حسن و قبح' خیر و شر یہ تمام اصول شریعت سے طے ہوتے ہیں' نہ کہ عقل سے۔ اللہ نے خیر اور شر کے جس مادّے کے امتزاج سے نفس کو خلق فرمایا ہے اس مادّے کے امتزاج میں خیر کو شر پر مستقلاً غالب رکھنا' اللہ کے بنائے ہوئے خیر کی روشنی میں ''عملِ تزکیہ'' ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیضانِ تربیت تھا کہ صحابہ کے لیے ''تزکیۂ نفس'' بندگی کی تکمیل کا نام تھا۔ تکمیلِ بندگی سے مراد ہے اللہ کی اطاعت اور اس کی پرستش میں صادق ہونا۔ ان دونوں کا مجموعہ دراصل وہ بندگی ہے' جس کے لیے اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے' جو

ازروئے قرآن ہمارا مقصدِ تخلیق ہے کہ اللہ کی بندگی کو اپنے تشخص کی واحد بنیاد بنائیں اور رسول اللہ ﷺ کے فیض اور تعلیم و صحبت سے صحابہ کرام ؓ اس بات کو صرف ذہنی سطح پر ہی نہیں بلکہ اپنے کل وجود کی قبولیت کے ساتھ سیکھ گئے تھے کہ بندگی کے تمام مراتب' اطاعت و پرستش کے تمام مدارج کو احسان کے ساتھ انجام دیتے رہنے کا نام "تزکیہ" ہے۔ صحابہ ؓ کے لیے تزکیۂ نفس کوئی علمی' ذہنی یا جزوی مسئلہ نہیں تھا' صحابہؓ کے لیے تزکیۂ نفس بندگی میں سچے ہونے کی ضرورت تھی۔ بندگی میں ان کی صداقت اور اخلاص نے تزکیہ کو گویا ان کی زندگی میں جاری تمام اعمال و افعال' تمام خیالات و احساسات کی واحد بنیاد بنا دیا تھا' اور یہی سبب ہے اُن کو یہ دوئی پیش نہیں آئی۔ صحابہؓ ہی نہیں بلکہ تابعینؒ' تبع تابعینؒ تک کو یہ دوئی پیش نہیں آئی جس کا ہمیں آج بہت شدت سے سامنا ہے۔ ہم مسجد میں جو ہوتے ہیں وہ دکان میں نہیں ہوتے۔ صحابہ کرام ؓ کے یہاں ان کی زندگی کا پورا در و بست بندگی پر محیط تھا' ان کی presence حالتِ رکوع میں بھی وہی ہوتی تھی جو خرید و فروخت میں ہوتی تھی۔ وہ حضورِ حق کے مسلسل تجربے سے گزار دیے گئے تھے۔ ان کا ہر عمل' چاہے وہ دنیوی ہو چاہے معروف معنوں میں دینی' موجبِ تزکیہ ہوتا تھا۔

صحابہ کرام ؓ کے فضائل میں ایک لاشریک فضیلت یہ ہے کہ ان کا سونا' جاگنا' دینی و دنیوی ہر عمل نتیجے کے اعتبار سے تزکیہ ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو تزکیہ کی کوشش کرنے والے' سچی نیت رکھنے والے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسے اختیار کرے' اور اس کے لیے ناگزیر ہے کہ صحابہ کرام ؓ کو اپنا model بنا کر تزکیہ کا وہی منہاج اختیار کرے جو رسول اللہ ﷺ کی شانِ تربیت سے اس جماعت میں فعال حالت کے ساتھ منتقل ہوا' اور جس کو انہوں نے زندگی کے ہر گوشے میں کمال تک پہنچا کر دکھایا۔ تزکیہ کوئی ذہنی فیصلہ' کوئی جزوی ارادی مراد یا ٹھیٹھ معنوں میں کوئی خاص عمل نہیں ہے۔ تزکیہ میرے وجود کی تمام قوتوں سے صادر ہونے والا فیصلہ ہے' جس کی میں اپنی زندگی کے ہر ہر عمل میں پابندی کرتا ہوں' اور اس کے نتیجے میں شخصیت کی اس تکمیل تک پہنچنا چاہتا ہوں' جہاں جو حالت مجھے اللہ کے حضور سجدے میں میسر ہے' عین وہی حالت مجھے کھیل کود میں بھی حاصل رہے۔ اللہ سے تعلق کی جو یکسوئی اور شدت مجھے تلاوت میں حاصل ہے' وہی یکسوئی اور شدت مجھے اخبار پڑھتے ہوئے بھی نصیب رہے۔ اس کو کہتے ہیں تزکیہ۔

اس تزکیہ کو اپنا مطلوب بنائے بغیر تزکیہ کی جزوی تدابیر اختیار کر کے ہم اس مقصد کو

حاصل نہیں کر سکتے۔ اس بات کو سادہ الفاظ میں اس طرح کہا جائے گا کہ اللہ کی طرف سے جن امتحانات کو پاس کرنے کے لیے مجھے دنیوی زندگی دی گئی ہے' ان امتحانات کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنی ہر حیثیت کو اپنی بندگی کے تابع رکھوں۔ میرا شوہر ہونا' باپ ہونا' امیر ہونا' مامور ہونا' انقلابی ہونا' خلوت نشیں ہونا' غرض میری زندگی کے جتنے بھی عنوانات اور جتنے بھی تشخصات ہیں' یہ سارے عنوانات اور پہچانیں ایک دائرے میں اکٹھی ہو کر باہم مربوط رہیں' اور وہ ہے بندگی کا دائرہ۔ میرے تعارف کی واحد اساس میری عبودیت بنے' میری شخصیت کا واحد جوہر بندگی بنے' یہ تزکیہ کا مقصود ہے' اور اس کے بغیر تزکیہ بے معنی اور خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے' کہ میں بعض دینی اعمال' بعض دینی خیالات کو polish کرتا چلا جاؤں اور اپنے وجود کے دیگر functional حصوں کو' اپنی شخصیت کے دیگر تشخصات کو بندگی کے دائرے یا بندگی کے binding discipline کے باہر رکھوں۔

تزکیہ اپنے کمالات میں کیسا ہوتا ہے؟

غیر انبیاء میں اوّل آفرینش سے قیامت تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس ہستی کی مثال ہے۔ حدیث میں ہے ایک مرتبہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پریشانی میں تھے' وہ گزرتے چلے گئے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راستے میں تشریف فرما تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک نظامِ معاشرت ترتیب دے کر عملاً جاری فرمایا تھا' اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ راستے کا حق یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے کو چلنے والا 'سلام' کیا کرے اور صحابہؓ اس بات کی بہت زیادہ پابندی کرتے تھے' بلکہ اتنی پابندی کرتے تھے کہ دو صحابیوں کے بیچ میں اگر کوئی پتھر آ جاتا تھا' ایک اِدھر سے ہو کر گزرے اور دوسرے اُدھر سے گزرے' تو دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھنے پر سلام کرتے تھے...... تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا اور سلام کیے بغیر گزر گئے' تو یہ بات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عجیب لگی۔ ذرا غور کریں' کیا معاشرت تھی' انہیں یہ عمل عجیب لگا' انہوں نے آواز دی اور کہا: بھئی تم کس غائب دماغی میں چلے جا رہے تھے؟ سلام ہی نہیں کیا......! سیدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تو ایک ایسی فکر میں پڑا ہوں کہ سب کچھ بھول بیٹھا ہوں۔ دریافت کیا: خیریت' کیا فکر لاحق ہے؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے لگتا ہے کہ میں منافق ہو گیا ہوں' کیوں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بیٹھتا ہوں تو دل کی حالت کچھ اور ہوتی ہے اور بیوی بچوں میں چلا جاتا ہوں تو وہ حالت برقرار نہیں رہتی...... یہاں

یہ بات بہت قابلِ توجہ اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک ''مسائل'' کیا ہیں؟ ان ''مسائل'' کو متاعِ حیات بنائے بغیر تزکیہ کے جھوٹے نعرے تو لگائے جا سکتے ہیں' اس مزاج کو پیدا کیے بغیر تزکیہ کی طرف سنجیدہ پیش رفت نہیں ہو سکتی۔

حضرت حنظلہ ؓ کہنے لگے یہ جو مجھے روگ لگ گیا ہے یہ بتاتا ہے کہ (نعوذ باللہ) میں منافق ہو گیا۔ اب یہاں ذرا غور کیجیے' اس بات کے سامع ہیں سیدنا صدیق اکبر ؓ' جنہیں اپنے جنتی ہونے پر ایمان رکھنا واجب تھا' یعنی ان کا جنتی ہونا ان کے لیے ایمان کا درجہ ہونا چاہیے تھا' کیوں کہ وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں' لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا: ارے بھئی! یہ حالت تو مجھے بھی پیش آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے میں بھی منافق ہو گیا! (نعوذ باللہ من ذالک)...... یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے لیے منتخب کیا تھا۔

آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ اوّل تو منبر پر ایک وعظ کرنے والا اور مریدوں میں دم درود کرنے والا' اپنے اندر ایسی مخلصانہ دور بینی نہیں پیدا کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو ان معیارات پر پرکھتا رہے کہ میرا دل کہاں' کس حال میں ہے؟ اپنے دل کے احوال اور ان احوال کے درمیان کسی عارضی یا مستقل عدم توازن پر نظر رکھنا اور اس کے نتیجے میں ایک فکر پال لینا کہ میں کس طرح اس عدم توازن کو دور کر سکتا ہوں...... یہ تو گویا اب دینی افکار سے' دینی طبائع سے' دینی شخصیات میں سے' الا ماشاء اللہ' خارج ہو چکا ہے' اور اگر آج بالفرض تکلفاً یا نفسیاتی سطح پر ایک عام آدمی کو بھی یہ وسوسہ پیش آ جائے کہ میں منافق یا کافر ہو گیا ہوں؟ تو وہ نہایت درجے کے حسنِ استدلال کے ساتھ' طرح طرح کی دلیلوں کے ساتھ' اس وسوسے کو اپنے طور پر رد کر کے مطمئن ہو جائے گا' لاحول ولا قوۃ میں کہاں سے منافق ہو گیا! اس کے دس بہانے بنا لے گا۔ یعنی وسوسۂ نفاق اور شائبۂ کفر کو ٹالنے کے لیے بہت مضبوط دلیلیں خود سے لے آئے گا۔ ایسا وسوسہ وقتاً فوقتاً سلیم الطبع لوگوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ (عام لوگوں میں) اوّل تو اب پیدا نہیں ہوتا' لیکن ہو بھی تو وہ شخص نہایت فصیح و بلیغ طریقے سے اس سے جان چھڑا لے گا۔

یہ ابو بکرؓ و حنظلہؓ کی گفتگو ہے۔ سیدنا ابو بکر ؓ معلمِ صحابہؓ ہیں' اور یوں سمجھ لیں صحابہ میں پیر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت حنظلہ ؓ کو تسلی دینے کی بجائے فوراً اس نقص' اس خطرے اور اس شائبے کو اپنی طرف منتقل کر لیا' اپنے آپ کو اس کا مصداق بنا کر کہا یہ تو واقعی

بات ہے، مجھے بھی پیش آتی ہے۔اس کا مطلب ہے میں بھی (نعوذ باللہ) منافق ہو گیا!

اب وہ دونوں ایک مشترکہ فکرمندی میں مبتلا ہو گئے اور اس فکرمندی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے جا رہے تھے۔ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر دونوں نے نہایت درجے کی فکرمندی اور خوف کے ساتھ اپنی یہ صورت حال بتائی۔ آپ ﷺ متبسم ہوئے اور فرمایا: کیا بات کرتے ہو، مؤمن کا دل خدائے رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہوتا ہے، اسے وہ اِدھر اُدھر پلٹتا رہتا ہے، یہ عین حالت ایمان ہے۔ (روایت بالمعنیٰ) اور جو تسلی دینی تھی وہ ارشاد فرما دی۔اس سے فوراً تسلی بھی ہو گئی۔

آپ یہ دیکھیں کہ جو نفس کے لیے سب سے خطرناک وسوسہ ہو سکتا ہے اس کی قبولیت بھی ''خیر البشر بعد الانبیاء'' میں فوراً ہو گئی، اور اس وسوسے کے رد کرنے کے لیے جو 'اتھارٹی' چاہیے، اس authority کی طرف سے کہا گیا ایک سادہ سا کلمہ اس کے ازالے کا حتمی ذریعہ بن گیا۔ اب ذرا سی دیر کے لیے یہاں ٹھہر کر یہ بھی سوچیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو تسلی کیوں نہیں دی؟ کیا ان کا دماغ (معاذ اللہ) اتنا بھی نہیں تھا جتنا آج کل ایک مولوی کا دماغ ہے؟ ان کی سمجھ (نعوذ باللہ) نفس اور اس کے احوال پر اتنی بھی نہ تھی جتنی آج کل کے دکھاوے کے دین داروں میں ہوتی ہے؟ یعنی وسوسوں کو ٹالنے کی تدبیر۔

جب میں ذاتی طور پر اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو شرمندگی اور ندامت تو فطری (natural) ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس باطنی بصیرت پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہوں ''یا اللہ یہ لوگ تو بندگی کی حقیقت سے بنائے گئے تھے!''......اگر کوئی یہ کہتا ہے مجھے کوئی ایسا وجود بتا دو جو بندگی کے ''آب وگل'' سے بنایا گیا ہو، جو بندگی کی حقیقت سے مجسم کیا گیا ہو، تو جب تک آپ غیر انبیاءؑ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیں گے اس وقت تک آپ کا جواب نامکمل رہے گا۔ یہ گویا وہ لوگ تھے جو درجۂ عبودیت پر خلق کیے گئے تھے اور انہیں بھی وہ عیب جو عبودیت کے سب سے زیادہ منافی ہے یعنی ''نفاق'' اس کا خدشہ اور دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کیا یہ منتہائے امید وبیم نہیں ہے؟ کیا یہ ہم پر یہ واضح نہیں کرتا کہ نفس میں تزکیہ کی خواہش کے لیے کیسا مزاج چاہیے؟ نفس کا تزکیہ بہت آسان ہے، لیکن تزکیۂ نفس کی طلب میں اوّلاً صادق ہونا ضروری ہے۔ آیا یہ دکھاوے کے لیے تزکیۂ نفس کی طلب کر رہا

ہے؟ ذہانت میں ترقی کے لیے تزکیۂ نفس کی طلب کر رہا ہے؟ یا یہ واقعتہً اپنے وجود کی انتہائی گہرائی کے ساتھ اپنی اصلاح اور تکمیل کا طالب ہے۔

تزکیہ کے لیے مطلوبہ مزاج

جس کے لیے اپنی اصلاح اور اپنی تکمیل مطلوب ہو، اس مزاج کی پہچان کے لیے کچھ خاص اور ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ ہم یہ دیکھیں کیا ہم اپنے آپ کو اس سطح تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ تزکیۂ نفس کی طلب میں صادق ہو جائیں یا اپنے نفس کو سنوارنے کی خواہش میں مخلص ہو جائیں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اس خیال کو پیدا کریں اور اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں کہ ''میرا ہر کمال مفروضہ ہے، ہر نقص یقینی ہے، موجود کمالات مفروضے ہیں، غائب نقائص حقیقی ہیں''......تو جو شخص یہ مزاج پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اپنے کمالات کو موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود پائے اور اپنے معائب اور نقائص کو غیر موجود ہوتے ہوئے بھی حاضر اور کارفرما سمجھے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ آدمی تزکیۂ نفس کا سچا طالب ہے۔ اگر ہم پہلے ہی قدم پر self defensive ہو گئے، یعنی ہم پہلے ہی قدم پر تاویل اور حیلے میں پڑ گئے تو ہم تزکیہ کے طالب نہیں ہیں، بلکہ ہم اپنی شخصیت کو اپنی مرضی کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، یعنی اپنی شخصیت کو اپنے مالک کی رضا کے تابع رکھ کر تعمیر نہیں کرنا چاہتے۔

پہلی بات میں نے عرض کی کہ اگر ہم غیر موجودہ نقائص کو بھی اپنے اندر موجود دیکھیں، اسی طرح اگر کوئی ہماری شخصیت کے بارے میں اعتراض کرے کہ ''آپ برے آدمی ہیں'' تو ہمیں یہ برا نہ لگے، ایک جذبۂ احسان مندی اور ایک حسِ خوف کے ساتھ ہم دیکھیں کہ ہاں! میں تو برا آدمی ہوں۔ اور فوراً متوجہ ہوں اس برائی کی طرف، اور پھر بہت دیر تک غور و فکر کے بعد اگر وہ برائی ہم اپنے اندر نہ پائیں تو بھی اس کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے اس برائی کے امکان سے ہمیں بچا لیا۔ کیوں کہ اس برائی کا یقینی امکان ہمارے اندر موجود ہے۔ اسی طرح جب کوئی آپ کی تعریف کرے تو اس تعریف کو مکمل نہ ہونے دینے کی شدید خواہش کرنا بھی اس کا دوسرا اہم پہلو ہے، کیوں کہ جو تعریف سے خوش ہو وہ نفس کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔ تزکیہ نام ہے اپنے نفس کی محبت کو اپنے نفس سے خارج کرنے کا۔

فنی اعتبار سے یہ بات یوں ہوگی کہ جس آدمی میں اپنی تنقید پر ناراضی یا defending

رہنے کا عادی ہو وہ تزکیہ کے لیے نااہل ہے۔ اسی طرح جو آدمی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہو، وہ تزکیہ کے لیے دوسری طرح کی نااہلی کا شکار ہے۔ self defensive system بیدار ہو جائے وہ تزکیہ کا طالب نہیں ہو سکتا، یعنی جو آدمی

اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے "انسان کی خلوت اُس کی جلوت سے لامحدود گنا اچھی ہو"۔ یعنی جس کی خلوت اُس کی جلوت سے اچھی نہیں ہے تو وہ تزکیہ کے لیے نااہل ہے، وہ تزکیہ کی کوشش کا آغاز ہی نہیں کر سکتا، اس کے اندر تزکیہ کی خواہش ہی نہیں پائی جاتی۔ چاہے وہ ظاہر میں انقلاب لے آئے، ساری دنیا کو دارالسلام بنا دے، اگر اس کی خلوت اس کی جلوت سے اچھی نہیں ہے تو اس کے کارنامے اپنی جگہ، یہ ناقص ہے۔ چناں چہ دوسرا درجہ خلوت کا جلوت سے اچھا ہونا، یہ لازم ہے۔ یہ اُس مزاج کی مستقل نشانی ہے اور وہ مزاج پیدا کرنے کا دوسرا تقاضا ہے جو تزکیہ کا طالب ہو اور جس پر تزکیہ کی کوششیں مفید طور پر اثر کر سکیں۔ اگر مزاج میں یہ دو چیزیں نہیں ہوں گی تو تزکیہ کی طلب سچی نہیں ہو گی، اور تزکیہ کی methodology کا کوئی اثر مرتب نہیں ہو گا۔

میرے خیال میں خاص طور پر وہ حضرات جو دین کی اجتماعی اقدار کی تشکیل کے لیے سرگرم رہتے ہیں، جو دین کے اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے کی مجاہدانہ جدوجہد کرتے ہیں، جو اپنے کام کے اعتبار سے اُمت کے محسن ہیں، ان لوگوں کو خاص طور پر یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ ان کی خلوت ان کی جلوت سے اچھی ہے یا نہیں؟ اگر ان کی خلوت جلوت سے اچھی نہیں ہے، پھر ان میں تحریکی قابلیتیں ہوں گی، لیکن دین داری نہیں۔ دین دار آدمی وہ ہوتا ہے جو خلوت کو محبوب رکھے اور جلوت کو حکم سمجھ کر صحیح کرے۔ یہ مزاج میرے لیے ایک وسیلہ بنے گا جب میں اللہ سے عرض کروں گا کہ یا اللہ! اپنی طبعی رغبت کے باوجود بہت زیادہ عبادات تنہائی میں اس لیے نہیں کر سکا کہ آپ کا حکم مجھ تک پہنچا کہ باہر نکل کر میرے نام کو اونچا رکھو، تو میں نے اپنی طبعی رغبت کو آپ کے حکم پر قربان کر دیا۔ اگر یہ مزاج نہیں ہے تو بہت زیادہ ڈر ہے کہ آدمی کا 'حق' بھی اُس کے نفس کے تابع ہو، آدمی کا تصورِ حق گویا اُس کے نفس ہی کا خلق کردہ ہو۔ مثال کے طور پر صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں ایک ٹائٹل ہے کہ "یہ لوگ راتوں کے راہب اور دن کے شہسوار تھے" (هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ)۔ یعنی ان کی راتیں عبادت میں اور دن جہاد میں گزرتا تھا۔ اگر ہم نے دن مجاہدوں والا اختیار کر لیا ہے اور رات راہبوں والی

choose نہیں کی تو دن کا جہاد بے معنی ہے' اور اگر ہم نے رات راہبوں والی منتخب کر لی ہے اور مجاہدوں والا دن اختیار نہیں کیا تو رات کی رہبانیت کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

تزکیہ کا اصل ہدف

اس ساری بحث سے جو ایک علمی اور نفسیاتی اصول برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نفس میں تزکیہ کا اصل ہدف اعمال نہیں ہیں' بلکہ نفس میں تزکیہ کا آغاز ہمیشہ طبیعت سے ہوگا۔ اگر طبیعت میں تزکیہ کی کیفیات نہیں ہیں تو اعمال کی تمام تر کثرت' درستی اور خیالات کی تمام تر صحت اور کاملیت بے فائدہ ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے جو اُسے کسی اصول سے وابستہ یا غیر متعلق رکھتی ہے۔ انسانی فیصلوں میں استقلال' دوام اور تسلسل پیدا کرنے والی واحد قوت اس کی طبیعت ہے۔ طبیعت کا تزکیہ ضروری ہے' طبیعت کے سدھارنے کا اہتمام ضروری ہے۔ ذہن کا عقائد پر راضی ہونا' اعمال کا احکام سے متعلق رہنا زیادہ بامعنی اور productive نہیں ہو سکتا۔ طبیعت کے تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تعلق' اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق' اللہ کے دین سے تعلق طبیعت کے لیے منتہائے رغبت بن جائے۔ میرے لیے سب سے بڑی کراہت اللہ سے دوری ہو اور میری سب سے بڑی رغبت اللہ کا قرب ہو۔

مختصراً یہ کہ اس ضروری جوہر کو طبیعت میں راسخ کیے بغیر دین کی عقائدی یا عملی مرادات کو بھی دین کے متعین کردہ معیار پر حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کوئی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احسان کو صلوٰۃ میں اس طرح ذکر فرمایا ہے گویا یہ نماز کی طرح فرض ہے۔ احسان کوئی مستحب امر یا کوئی زائد وصف نہیں ہے' بلکہ احسان نماز کی main body کا حصہ ہے اور نماز کے حکم کی "مراد" ہے۔ احسان کے بغیر نماز' نماز نہیں ہے۔

اگر ہم اپنی طبیعت کو تزکیہ کے عمل سے نہیں گزارتے تو اس درجۂ احسان کا حصول ممکن نہیں ہے اور طبیعت کی شمولیت کے بغیر اس کے حصول کا کوئی ایک راستہ بھی طے کرنا ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تزکیۂ نفس کا اصل مدار تزکیۂ طبیعت پر ہے۔ جس کی طبیعت کا تزکیہ نہیں ہوگا' اس کا عملی تزکیہ گویا شروع ہی نہیں ہوا۔

تزکیہ کی تین بنیادیں

ہمارے اَسلاف کا مزاج خشیت پر مبنی تھا۔ سلف سے ظاہر ہے کہ مراد اوّل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ صحابہؓ کے یہاں خشیت ان کی دین داری کا جوہر تھی۔ صحابہؓ کا دینی وجود خشیت کے جوہر پر

تشکیل پاتا تھا۔ صحابہؓ کے بعد کے ادوار میں خشیت کی جگہ "علم" نے لے لی۔ علم کے ادوار گزرنے کے بعد علم کی replacement محبت بنی۔ یہ تین ادوار ہیں جنھیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے "محفوظ زمانے" تھے۔ محفوظ زمانوں سے میری مراد ہے جب دین انفرادیت اور اجتماعیت کی تشکیل کا واحد سبب تھا۔ یعنی جب ہم کہتے ہیں "محفوظ زمانہ" یا "اچھا زمانہ" تو اس سے مراد ہوتی ہے: "ہمارا دین اللہ کے فضل سے اتنا فعال اور نتیجہ خیز تھا کہ ہماری نفسیات اور ہماری تہذیب دونوں دین کے اصول پر بنے تھے۔"

یہ ان زمانوں کی بات ہے جب فرد بھی دین کے سانچے میں ڈھلا کرتا تھا اور معاشرہ بھی دین کے اصول پر کھڑا تھا۔ ان زمانوں میں تزکیۂ نفس کی تین حالتیں تھیں، یعنی "نفسِ مزکی" کے تین احوال تھے۔ صحابہؓ کے احوالِ تزکیہ میں خشیت غالب تھی، تابعین اور تبع تابعین کے اسبابِ تزکیہ میں علم غالب تھا اور اس کے بعد محبت غالب ہوئی، جہاں سے تصوف شروع ہوا۔ لیکن ان تینوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ علم نے آ کے خشیت کو خارج کر دیا، محبت نے آ کے علم اور خشیت دونوں کو دیس نکالا دے دیا۔ بس ان تینوں عناصر میں غلبے اور ترجیح کی بات ہے، اور وہ غلبہ اور ترجیح بھی مزاجی ہے نہ کہ ذہنی۔ اس سے جو اصول نکلتا ہے یا جو مدد ملتی ہے وہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کی تین بنیادیں ہیں: خشیت، معرفت اور محبت۔ ان تین بنیادوں میں سے جس جزو کا بھی غلبہ ہو جائے، دوسروں کی نفی کیے بغیر، تو وہ نفس کو مزکی بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر خشیت دو پر غالب ہے، دونوں کو موجود رکھتے ہوئے، تو بھی تزکیۂ نفس نقد ہے۔ اگر معرفت مرکزی حیثیت اختیار کر جائے تو بھی نفس کا سدھار یقینی ہے، ان شاء اللہ۔ اگر محبت باقی دو کا مدار بن جائے تب بھی نفس کا مزاج بندگی میں ڈھل جانا آسان ہے۔ ان تینوں "جواہر نفسِ مزکی" کو نشوونما دینے کی ذمہ داری اٹھایئے۔ اللہ کی خشیت، اللہ کی محبت اور اللہ کی معرفت، یہ نصابِ تزکیہ ہے۔

تزکیہ کی تمام تفصیلات مزاج کے فرق کی رعایت رکھتے ہوئے ان تین لفظوں میں ہیں۔ تزکیہ انہی تین بنیادوں پر ہوگا، چاہے ان تین بنیادوں میں سے مزاجی مناسبت کسی ایک سے ہو۔ جب تک ہماری مزاجی و ذہنی مماثلت و مناسبت ان تین اقدارِ تزکیہ سے نہ ہوگی، اس وقت تک تزکیہ مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں رہے گا۔ یہ تین اقدار اصلاً حق تعالیٰ سے تعلق کی تین حالتیں ہیں۔ یہ تعلق مع الحق کے تین مستقل آداب ہیں۔ اگر "تعلق مع الحق" ایک فعال حالت میں اور

ایک محفوظ اور مسلّم method کے ساتھ ہمارے اندر functional اور operative نہ ہو تو تزکیہ کے عمل کا کوئی لائق اعتماد مفہوم نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد ؒ اور تنظیم اسلامی

اب ایک بات میں عاجزانہ اپنائیت سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قبلہ ڈاکٹر صاحب سے ایک شخصی درجے پر تعلق کا تجربہ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ؒ اور ان کی تنظیم کی جو داخلی بناوٹ ہے وہ اس تعلق کے نتیجے میں میری بساط بھر میرے علم میں ہے اور میں ان کی بنائی ہوئی تنظیم کے افراد کو دیگر جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ potent سمجھتا ہوں یعنی جن میں دینی امکانات زیادہ ہوں اور اس تنظیم کے جو عملی اصول ہیں ان میں جامعیت دیکھتا ہوں۔ یعنی یہ تنظیم تزکیہ کے جس مقصود کو حاصل کرنا چاہتی ہے وہ تزکیہ کا ایک مستقل مقصود ہے۔ یعنی ”نفس کو بھی حق کے تابع کرو اور آفاق کو بھی حق سے مغلوب رکھو“۔ عام طور پر جو دینی تحریکیں ہوتی ہیں یا دینی تحریکوں کے پیچھے کارفرما جو فکر ہوتی ہے اس میں اصلاحِ نفس کا پہلو بہت بڑی حد تک دب جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی achievement ہے جو فکری سطح پر ہوئی ہے اور اس فکر سے پیدا ہونے والی جماعت کے مزاج کا حصہ بھی بن گئی ہے۔ آپ حضرات اگر اس سلسلے میں کچھ زیادہ انہماک اور نسبتاً کچھ زیادہ پھیلاؤ اور قدرے علمی گہرائی کے ساتھ کام کریں تو ممکن ہے آپ کو آپ کے بعض خارجی نتائج حاصل ہونے میں دیر لگ جائے لیکن اس سلسلے میں آپ تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ رکھنے کے سلسلے میں مجھ ایسے لوگوں کے مقابلے میں بہت بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مشاہدے کی حد تک تزکیہ کے مقصد کو شدت کے ساتھ ہمیشہ مدِنظر رکھنے کی ضرورت دو طبقات کو زیادہ ہے۔ ایک وہ جو تعلیمِ دین سے وابستہ ہیں یعنی معلمین اور دوسرے تحریکی طبقات کو تزکیہ کی ضرورت کا قائل اور اس پر عامل ہونے کی ضرورت عام آدمی سے زیادہ ہے لیکن یہ ضرورت حدِ مطلوب تک پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین!

سوال و جواب

سوال: بنیادی طور پر ایک عام آدمی کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ تصوف دین سے متصادم ہے

کیوں کہ آج جو کچھ مزاروں پر ہو رہا ہے' مثلاً قوالیاں اور عرس وغیرہ' اس کو ذرا واضح کر دیں۔

جواب: جی ہاں! تصوف اپنے موجودہ institutions میں اور اپنے حاضر مظاہر میں ایک خطرناک روایت بن چکا ہے' جو بے معنی اور مضر بھی ہے۔ جس قصباتی تصوف سے ہمیں واسطہ ہے' اس کا جلد از جلد فنا ہونا ہی اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کو defend کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ یعنی اگر ہم فقہ والے سے پوچھیں کہ فقہ کے کیا فائدے ہیں تو وہ کچھ ادارے اور کچھ لوگوں کے نام بتا دے گا' ایک روایت کا تسلسل بتا دے گا۔ مگر تصوف والے سے پوچھا جائے تو اس کے پاس اپنے جواز اور validity ثابت کرنے کے لیے صرف ماضی موجود ہے۔ تو اس صورت حال میں میں نہیں سمجھتا کہ اس کا دفاع کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہیے۔ جہاں تک بات ہے ان حضرات کی وحشت کی تو اگر وہ موجودہ مظاہر کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے' تو وہ وحشت اپنے ہر جزو میں ٹھیک ہے اور وہ ہونی بھی چاہیے' کیوں کہ اپنے موجودہ مظاہر میں تصوف بڑی حد تک' الا ماشاء اللہ' سنت کی راہ میں رکاوٹ بن چکا ہے اور بڑی حد تک دینی ذوق کی آبیاری کو روکنے والا ادارہ بن چکا ہے۔ میں بھی اس وحشت میں شریک ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ روایت اپنے تمام موجود مظاہر کے ساتھ ایک ایک کر کے ختم ہو جائے' تاکہ تزکیۂ نفس کا عمل ان نام نہاد ٹھیکے داروں کے ہاتھ سے نکل کر مسنون فضا میں داخل ہو سکے۔

سوال: احسان کیا ہے؟

جواب: احسان تزکیہ و تصوف کا متبادل لفظ ہے۔ احسان ایک حالِ دید ہے' دید کے بغیر۔ احسان کا مطلب ہے دید کا حال جو دید کا دعویٰ کرنے کی اجازت نہ دے۔ حالِ دید تین ہی نتائج مرتب کرے گا۔ ایک مزاج کے لیے محبت کو بڑھا دے گا۔ دوسرے مزاج کے لیے خشیت کو بڑھا دے گا۔ تیسرے مزاج کے لیے معرفت کا سبب بنے گا۔ تو اصل چیز "احسان" ہے' اللہ کے حضور میں رہنا اور اللہ کو استحضار میں رکھنا۔ اس سے بچنے کے لیے بعض لوگ مختلف activities اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی دینی زندگی کی مصروفیات اس فریضے سے بچنے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔

سوال: رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا تزکیہ تو ہو چکا تھا' ہم مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کس طرح explain کریں گے؟

جواب: یہ چیز بہت ہی natural way میں دیکھی جا سکتی ہے کہ بنائے مشاجرات نفس

نہیں تھا۔ اگر نہ بنائے اتفاق نفس ہو اور نہ بنائے مشاجرات نفس ہو تو یہ نفسِ مزکی کے مظاہر ہیں۔ اس کے لیے صحیح الفکر' کامل القول' اور منتہی الحال ہونا ضروری نہیں ہے' معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس پروری کو بے نفسی سے طاقت ور نہیں ہونا چاہیے' نہ کہ نفس پروری کے داعیہ کا ازالہ مقصود ہے۔ صرف اور صرف حق' خیر اور جمال کا غلبہ ہونا چاہیے باطل' شر اور بدصورتی پر۔

سوال : آپ نے فرمایا حضوریٔ قلب جیسی سجدے اور رکوع میں ہو وہی تکمیل اور دوسری چیزوں میں بھی ہو۔ موجودہ دور میں فرض کریں ایک پیر صاحب ہیں' کسی غیر شرعی کام میں مصروف ہیں' ایک عام آدمی جب ان پر حرف گیر ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے یہ معرفت کی باتیں ہیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اُس وقت ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ ہم ان کو پہچان سکیں؟

جواب: قرآن وسنت' صورت اور حقیقت دونوں پر حاکم ہیں۔ کوئی حقیقت منظور نہیں جب تک وہ بلا تاویل قرآن وسنت سے ثابت نہ ہو' اور کوئی صورت منظور نہیں جب تک کہ وہ بلا ترمیم قرآن وسنت سے متبادر نہ ہو اور تسلسل کے ساتھ نہ پہنچی ہو۔ ان دو اصولوں پر قائم رہیں کہ میرے مذہب کی آفاقیت کی سند بھی وہیں سے ہونی چاہیے اور میرے دین کا انفسی دروبست یعنی باطنی احوال بھی وہاں سے واضح طور پر ماخوذ ہونے چاہئیں' اور جو ذرائع ان دو سندوں نے فراہم کیے ہیں' انہی سے پیدا ہونے چاہئیں اور اس پر کوئی compromise نہیں ہونا چاہیے۔

سوال : اس صورت حال میں کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟

جواب: اصل چیز ہے اپنے گھر کو بدلنا' یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ہم اگر اپنے قریب ترین تعلقات میں بنیاد اللہ کو بنالیں' اگر اپنے عزیز ترین مفادات میں مقصود اپنے اللہ کو بنالیں' تو ہماری ساری خرابیاں وعظ ونصیحت کے بغیر دور ہو جائیں گی۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ فوری مفادات ہمیں عزیز ہیں اور مفاداتِ آخرت سے مناسبت رسمی سی رہ گئی ہے۔ اگر میں آج فیصلہ کر کے جاؤں اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو یہ جتادوں کہ میری اور تمہاری محبت غیر مشروط نہیں ہے' میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں' لیکن یہ کچھ شرائط کے تابع ہے۔ اگر میں اپنے بچوں کو یہ باور کرادوں کہ میرا پورا نظامِ تعلق' اللہ کے تعلق کی تفصیل کے علاوہ کچھ نہیں ہے' تو آپ دیکھ لیجیے گا...... اگر ہم سب متفق ہو کر یہ رویہ اختیار کر لیں تو دو سال کے اندر سوسائٹی کا موجودہ طاغوتی نظام گر سکتا ہے۔ آج اگر ہم چار باتیں طے کر لیں تو ہمیں ہمارے موجودہ ابتلا سے نکلنے کی ایک

ٹھوس بنیادبن سکتی ہے، جس کے نہ ہونے سے ہم موجودہ ابتلا کا شکار ہیں:

۱) مجھے اپنے ہر موضوع کو مذہبی افادیت کا حامل اور ضامن بنانا ہے۔

۲) مجھے اپنے ہر تعلق کو تعلق مع الحق کا ذریعہ بنانا ہے۔

۳) مجھے اپنی خلوت کو اپنی جلوت سے اچھا رکھنا ہے۔

۴) مجھے اچھا پڑوسی بننا ہے۔

ان چار باتوں سے وہ معاشرتی اور نفسیاتی تزکیہ کی قوت پیدا ہوگی جو ہمیں ابتلا سے نکالنے کا سبب بن سکتی ہے۔

سوال: علم نافع سے کیا مراد ہے۔کون سا علم ''علم نافع'' ہوگا؟

جواب: علم نافع تین بنیادوں پر ہوتا ہے:

۱) وہ علم جس کے نتیجے میں اللہ کی معرفت میں ترقی ہو۔

۲) وہ علم جو دنیا میں مفید ہو اور آخرت میں افادیت رکھے۔

۳) دنیا میں نفع دے اور آخرت میں مضر نہ ہو۔ یہ بھی علم نافع ہے۔

❁❁❁

بقیہ : بحث ونظر

اس عمل میں انگلینڈ کی Enclosure movement نے تیزی دکھائی، جس کے تحت عوامی زمینیں بڑے زمینداروں کو دے دی گئیں جو زمین کو بھیڑیں چرانے کے لیے استعمال کرتے۔ کارل مارکس کے بقول ٹھیکے دارانہ تعلق کا عروج، زمیندار اور مزارع کے مزارعانہ، کاشت کارانہ تعلق کے ٹوٹنے سے جڑا ہے۔

دوسری طرف جاگیرداری نے سولھویں صدی تک سرمایہ داری کا گلہ گھونٹے رکھا، لیکن پھر نئی ٹیکنالوجی اور ایجادات کی اچانک نمود، خاص طور پر زراعت اور سیاحت کے شعبوں میں، نے سرمایہ داری کی ترقی میں جان ڈال دی۔ جاگیرداری کے اختتام پر سب سے اہم تبدیلی سرمایہ دار تاجروں اور محنت مزدوری کرنے والوں کے درمیان دوئی (dichotomy) تھی۔

(جاری ہے)